ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی

مقامِ محمد ﷺ

قرآنِ کریم کے آئینے میں

﴿۲﴾

تنذیر و تبشیر

نبی جب اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچاتا ہے تو وہ اللہ کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر چلنے والوں کو دونوں جہانوں میں فوزِ کبیر، نجات نفس مطمینہ کی بشارت دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ کے احکام کی تقلید اور نبی کی اتباع سے یہی دُنیا جنت کا دیباچہ بن جاتی ہے۔ اہلِ ایمان خوف اور حزن سے بلند تر ہو جاتے ہیں، اُن کا وجود دُنیا کے لئے ابرِ رحمت بن کر نشو و نما کا سبب بنتا ہے اور پھر اُن کے لئے آنے والی دنیا کا نام جنت ہے۔

انبیا کی دعوت میں ابتداً تنذیر کا رُخ نمایاں تر ہوتا ہے۔ کیونکہ جب تک لوگ شرک، دین آبا اور اپنے رسم و رواج کو ترک نہیں کریں گے نئے راستے پر آغازِ سفر نہیں کر سکتے اور نئے راستوں کو اپنانے والے ہی بشارتوں کے مستحق ٹھہریں گے۔

اردو میں نذر کا لفظ استعمال ہوتا ہے، لیکن مختلف معنی میں، اگرچہ وہ معنی بھی اس لفظ کے بنیادی مفاہیم میں شامل ہیں۔ آپ جب نذر مانتے ہیں تو کسی ایسی چیز کو اپنے اوپر لازم کر لیتے ہیں جو چیز آپ پر لازم اور واجب نہیں تھی۔ نذر ماننے کے بعد آپ کو وہ کچھ کرنا ہوتا ہے جو اُس نذر سے وابستہ ہو اور اُس سے پہلو تہی اور روگردانی کی کوئی گنجائش نہیں رہتی رسالت و نبوت کے حصول کے بعد اللہ تعالیٰ تنذیر کو نبی پر واجب کر دیتا ہے اور یوں وہ اپنی قوم کو اس کے طرزِ حیات، گمراہیوں اور

گناہوں کے سلسلے میں خبردار اور آگاہ کرتا ہے اور اُن کے عواقب و نتائج سے ڈراتا ہے۔

''ڈرانے'' کا عمل کئی پہلو اور سطحیں رکھتا ہے۔ اگر آپ کسی چیز کی مضرتوں سے پوری طرح واقف نہیں ہیں تو اُس سے کس طرح ڈرا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ منصبِ نبوت پر فائز کرتے ہی نبی کو وہ علم عطا کرتا ہے کہ کفر و ظلمت کی ہر تاریکی اُس پر روشن ہو جاتی ہے۔ اُس کی قوم والوں کے لئے اپنے اندازِ زندگی پر تنبہ ایک نئی چیز ہوتا ہے کیونکہ دینِ آبا کو وہ ایک حقیقت کے طور پر اختیار کر لیتے ہیں اور اُس کے بارے میں سوچتے نہیں۔ نبی اُن کو متنبہ کرتا ہے کہ موت آنے سے پہلے آنے والی زندگی کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لو۔ فوج کے ہراول دستے کو ''نذیرۃ الجیش'' کہا جاتا ہے جو دشمن کی نقل و حرکت سے فوج کو خبردار کرنے کے لئے لشکر سے آگے آگے رہتا ہے اور دشمن کے ممکنہ اقدام کے مشاہدے کی کوشش کرتا ہے۔(۱)

رسول کے سامنے دونوں دنیائیں ہوتی ہیں۔ وہ ایسے مقامِ بلند پر ہوتا ہے کہ ہر منظر اُس کے سامنے کھلے ہوئے ورق کی طرح ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کافی دنوں تک اپنے نہایت قریبی اور معتمد لوگوں تک تبلیغ اسلام کو محدود رکھا اور پھر وہ مرحلہ آ گیا جب رب العزت جل جلالہٗ نے حکم دیا۔

وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ۝ (۲)

اور آپ قریب کے رشتہ داروں کو ڈرسنا دیں (اور انہیں متنبہ کر دیں)۔

اِس حکم پر عمل کرتے ہوئے آپ نے صفا کی بلندی سے قریش والوں کو آواز دی۔ اُس پہلی دعوت کا ذکر احادیث کے مجموعوں میں موجود ہے۔ اِن مجموعوں کے ایک باب کا عنوان ہی ''باب الانذار والتحذیر'' ہے۔ بخاری شریف اور مسلم شریف میں حضرت ابنِ عباس کی یہ حدیث ہے۔

''حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی : وَاَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صفا پر چڑھے اور آپ ﷺ نے پکارنا شروع کیا، ''یا بنی فہر''، ''یا بنی عدی'' اور یوں ہی قریش کے قبیلوں کو پکارتے رہے یہاں تک کہ سب جمع ہو گئے پھر آپ نے فرمایا کہ اگر میں تم کو خبر دوں کہ وادی میں ایک لشکر موجود ہے جو تم پر حملہ کرنے والا ہے تو کیا تم میری اِس بات کو سچ مان لو گے۔ اہلِ قریش نے کہا ہاں کیونکہ ہم کو سچ کے علاوہ تم سے کسی بات کا تجربہ نہیں (یعنی ہم نے تمہارے منہ سے سچ کے سوا کچھ نہیں سنا)۔ اس پر آپ نے فرمایا

کہ میں تمہارے لئے نذیر بن کر آیا ہوں اور عذابِ شدید کے واقع ہونے سے پہلے تمہیں ڈرا رہا ہوں۔ اس پر ابولہب نے کہا کہ تمام دن تم پر ہلاکت مسلط ہو۔ کیا اسی بات کے لئے تم نے ہمیں جمع کیا تھا۔ اُس کی اس بات پر یہ سورہ نازل ہوئی: تَبَّتْ يَدَا اَبِىْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ۔

اور ایک روایت میں ہے آپ نے آواز دی:

> اے بنی عبدِ مناف میری اور تمہاری مثال اُس شخص جیسی ہے جس نے دشمن کو دیکھ لیا اور وہ اپنے گھر والوں کی حفاظت کے لئے چلا۔ اُسے خوف ہوا کہ دشمن سبقت نہ لے جائے اور وہ چلایا، یا صباحاہ۔ (۴)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پہلی دعوت عام، یہ تنذیر اور یہ ڈراوا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اِس سے وہ سلسلۂ تنذیر و تبشیر شروع ہوا جس نے کائنات کو ایک نئی روح اور عہد عطا کیا۔ یہی سبب ہے کہ اُس کی اور تفاصیل بھی محفوظ ہیں۔ آپ نے تعمیم اور تخصیص، دونوں سے کام لیا۔ ایک طرف آپ نے قریش کے قبیلوں سے خطاب فرمایا اور دوسری طرف اپنے قریبی عزیزوں اور پیاروں سے خطاب فرما کر یہ حقیقت واضح کی کہ عذاب سے صرف ایمان اور اعمالِ صالح ہی نجات دلا سکتے ہیں۔ مسلم کی حدیث ہے، ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت : وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ۔ کہ اپنے قریبی رشتے داروں کو (آنے والے عذاب سے) ڈراؤ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کو بلایا اور اِس سلسلے میں آپ نے تعمیم اور تخصیص سے کام لیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

> اے بنی کعب بن لوی! اپنی جانوں کو آگ سے بچالو۔ اے بنی مرہ بن کعب! اپنے آپ کو آگ سے بچالو۔ اے بنی عبد شمس اپنے نفس کو آگ سے بچالو۔ اے بنی عبد مناف! اپنے آپ کو آگ سے بچالو۔ اور اے فاطمہ! اپنے آپ کو آگ سے بچالے کیونکہ میں تمہارے لئے اللہ کے ہاں حقِ قرابت کے سوا کسی چیز کی ملکیت نہیں رکھتا۔ (۵)

اور متفق علیہ حدیث ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

> اے گروہِ قریش! (ایمان کے عوض) اپنی جانوں کو خرید لو (اور اپنے آپ کو نجات دلادو) کیونکہ میں اللہ کے عذاب میں سے کوئی چیز تم سے دور نہیں کر سکتا۔ اور اے بنی عبد مناف! میں اللہ کے (کسی قہر سے) تمہیں بچا نہیں سکتا۔ اور اے عباس بن مطلب! میں اللہ کے ہاں تمہیں کسی چیز سے مستغنی نہیں

کر سکتا۔ اور اے صفیہ! اللہ کے رسول کی پھوپھی! میں اللہ کے ہاں تمہارے کسی
کام نہیں آسکتا اور اے فاطمہ! محمد ﷺ کی بیٹی! تم میرے مال سے جو چاہو مانگ کر
لے سکتی ہو لیکن میں اللہ کے ہاں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا۔(۶)

خوش خبری سے پہلے ڈراوا۔ یہ منطقی ترتیب ہے۔ ایک نئے طرزِ حیات کو اپنانے اور نئے تصورات کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے سے پہلے یہ لازم ہے کہ آدمی اپنی غلط روشِ زندگی سے نجات پالے۔ اور باطل تصورات و خیالات کو ترک کر دے تاکہ دل و دماغ نئے نظامِ اقدار و تصورات کو قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔

حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے مختلف قبیلوں سے خطاب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے چچا، اپنی پھوپھی اور اپنی بیٹی کو خاص طور پر مخاطب فرمایا تاکہ اِس نئے مگر آخری پیغام کو سننے والوں کو سنتِ الٰہی سے آگہی حاصل ہو سکے اور وہ جان لیں کہ اللہ کی سنت میں کسی کی خاطر کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اُس کے حضور کوئی رشتہ ناتا کام نہیں آتا بلکہ اعمال و عقائد کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے فیصلے ہوتے ہیں۔

دوسری تفصیلات پیش کرنے سے پہلے یہ عرض کر دینا مناسب ہوگا کہ انذار کا اثر ''دلِ زندہ'' ہی قبول کرتا ہے۔ وہ افراد اور وہ گروہ جو اپنی غلط روش کو بدلنا نہیں چاہتے ہدایت اور فلاح سے انہیں حصہ نہیں ملتا۔ یہ درست ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ ہی عطا کرتا ہے، مگر انسان کو ربِ جلیل نے عقل، ارادہ اور قوتِ تمیز عطا کر دی ہے، اور جو راہِ ہدایت کے طالب ہوتے ہیں اُن کے راستے روشن کر دیئے جاتے ہیں۔ وہ اللہ کی طرف ایک قدم چلتے ہیں تو اللہ ان کی طرف دس قدم چلتا ہے۔ مگر جو ابولہب کی طرح اپنی گمراہی پر فخر کریں اُن کی شقاوت اُن کو جہنم کی طرف لے جاتی ہے۔ اُن کے لئے ربِ کائنات کا فرمان ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَ اَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ (۷)

بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اُن کے لئے برابر ہے آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں۔ وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ اللہ نے اُن کے دلوں پر مُہر لگا دی اور اُن کے کانوں پر اور اُن کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے۔

یہ اُنہیں کافروں کا ذکر ہے جو لاعلمی کی وجہ سے اللہ، اُس کے کلام اور رسولوں کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ جنہوں نے شعوری طور پر کفر کو اختیار کیا۔ وہ جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہیں۔ سورۂ البقرہ اور قرآنِ حکیم کے کئی مقامات میں ایسے کافروں کا ذکر ملتا ہے۔

اِن دونوں آیات پر غور کیجئے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ مقصودِ کلام ایسے کافروں کے کفر کے اظہار سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے۔ محمد مجتبیٰ علیہ الصلوۃ والسلام کا قلبِ مطہر رحمت ورافت کا سرچشمہ اور انسانی محبت کا سمندر تھا۔ آپ ﷺ حق سے گریزاں افراد کی ہمدردی میں راتوں کو جاگتے رہتے، اُن کے لئے دعا کرتے اور اُن کے لئے آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ انبیائے کرام علیہم السلام اور بالخصوص رحمۃ للعالمین کے انذار اور ڈراوے کی بنیاد، آپ ﷺ کی محبت وشفقت تھی۔ نذیر میں بشیر کا پہلو بھی موجود ہے۔ نذیر اپنی محبت اور شفقت کی بنیاد پر لوگوں کو اُن کے غلط طرزِ حیات سے ڈراتا ہے۔

سورۂ الفرقان میں ربِ کریم نے ایک بڑے پس منظر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے اور انذار وتبشیر کے مرحلوں اور معانی کو پیش فرمایا ہے۔ جس طرح زمین مردہ کو ہواؤں اور بارشوں کے ذریعے زندگی عطا کی جاتی ہے اسی طرح انسانیت کے باغ کے لئے رسول بشارت دہینے والی ہواؤں اور پاک پانی کا درجہ رکھتے ہیں۔ لیکن جو کفر وطغیان کو اپناتے ہیں وہ اس مشاہدے اور ان مثالوں سے بھی ہدایت حاصل نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے فرمایا کہ اِن ناشکروں کا مقابل جہاد اور استقامت سے کیجئے اور اِن پر یہ حقیقت واضح کر دیجئے کہ میری یہ جدوجہد کسی اجر کی محتاج نہیں۔ میں کسی سے کوئی اجر طلب نہیں کرتا، میرا اجر تو یہی ہے کہ لوگ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلیں۔ اور یہ بات خالقِ کائنات نے اس وقت فرمائی جب پورے عالمِ انسانیت کے لئے ایک نذیر آچکا تھا۔ وہ نذیر جو ہر دور کے لئے آیا۔ مختلف قوموں کے لئے نذیر بھیجنے کا دور گزر چکا تھا۔

وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِیْ كُلِّ قَرْیَةٍ نَّذِیْراً ○ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِیْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِیْرًا ○ وَهُوَ الَّذِیْ مَرَجَ الْبَحْرَیْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّ هٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ وَ جَعَلَ بَیْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ○ (۸)

اور اگر ہم چاہتے تو ہر بستی میں ایک نذیر وڈرانے والا مبعوث کر دیتے۔ پس اے

نبی ﷺ! اِن کافروں کی بات نہ مانو، اور اِس قرآن کے ساتھ اِن کے خلاف جہادِ کبیر کرو۔

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے ایک میٹھا پیاس بجھانے والا اور دوسرا کھاری کڑوا اور دونوں کے بیچ ایک پردہ ہے اور اِس آڑ نے انہیں گڈمڈ ہونے سے روکا ہوا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے ہر بستی کے لئے، ہر قوم کے لئے مختلف ادوار میں نذیر بھیجے، مگر اب تاریخ کا وہ عہد آگیا کہ انسانیت کے لئے اللہ کے پیغام کی تکمیل ہر زمین اور ہر زماں کے لئے کر دی جائے۔

اور اب نذیر کامل کے فرائض بہت وسیع اور سنگین تھے۔ اِن فرائض کا تقاضا ''جہادِ کبیر'' تھا۔ الفرقان مکی سورہ ہے اور اُس وقت تک جہاد بالسیف کا حکم نہیں آیا تھا، اِسی لئے یہاں جہاد کا لفظ انتہائی جدوجہد کے معانی میں ارشاد کیا گیا ہے۔ جہد کے لفظ میں وسعت، طاقت اور تکلیف و مشقت کی انتہائی حدود کے مفاہیم شامل ہیں اور اِس جہاد اور جدوجہد کے لئے آپ کو وہ ہتھیار عطا کیا گیا جس نے فاروقِ اعظم جیسے انسان کی تقدیر کو دگرگوں کر دیا، اور جس نے پہاڑوں کو زمیں بوس کر دیا، ''جاہدہم بہٖ'' میں بہٖ کا مرجع قرآنِ حکیم ہے۔ ''جہادِ کبیر'' میں انسانی کوشش و مشقت کا ہر پہلو آجاتا ہے۔ آپ ﷺ کو حکم یہ دیا جارہا ہے کہ قرآنی حقائق کو پیش کرو اور اپنے تمام ذرائع، صلاحیتوں اور وسائل کو تنذیر کے کام میں صرف کرو، مگر تمہارا حقیقی اور عظیم ترین وسیلہ قرآنِ حکیم ہے۔ اِسی کے ساتھ ساتھ ہر محاذ پر اُس محاذ کے تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق اپنے وسائل کا استعمال کرو۔ اِس آیت میں جہاد بالسیف کے امکان کی طرف بھی اشارہ ہے جو مدینہ منورہ کے دور میں حکمِ ربانی کی صورت سامنے آیا۔

اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا کر کہ کافروں کی بات نہ ماننا، اپنے نبی کو فتح کا یقین دلا دیا۔ پھر ذکر دو سمندروں کا آیا ہے۔ میٹھے پانی کا ذخیرۂ آب، اور کھاری پانی کا ذخیرہ۔ یہ دونوں ایک ساتھ موجود ہیں اور آبِ شور اپنے حجم اور وسعت کے باوجود آبِ شیریں کو اپنے آپ میں گم نہیں کر سکتا۔ راقم الحروف نے چین میں دو دریاؤں کو ایک دوسرے سے یوں ملتے دیکھا ہے کہ اُن کی درمیانی آبی لکیر اور تقسیم کرنے والا خط صاف نظر آتا ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنی تفسیر میں بنگال اور دوسرے مقامات کی مثالیں دی ہیں۔(۹) جغرافیائی حقیقت یہ ہے کہ جہاں دو دریا ملتے ہیں وہاں یہ

صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سمندروں میں میٹھے پانی کے چشمے موجود ہوتے ہیں، لیکن اِن آیات اور اِن کے معنوی ربط پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ انسانی معاشرے کا ذکر ہے۔ وہ جو باطل پرست ہیں کھارے پانی کے سمندر کی مثال ہیں اور اہلِ ایمان شریں چشمہ آب کی طرح ہیں، اور اِس شریں ذخیرۂ آب پر کھارے پانی کا سمندر غالب نہیں آسکتا۔ اللہ کی قدرت، اُس کا قانون اور اُس کا بھیجا ہوا نذیر (رسول) اِن دونوں کے درمیان عظیم آڑ اور رکاوٹ ہے اور آگے بڑھ کر قانونِ الٰہی کے تحت کھارے پانی کی سرحدیں سمٹتی جاتی ہیں اور میٹھا پانی (ایمان) نئی نئی وسعتوں سے آشنا ہوتا جاتا ہے۔

رسالت کے اِس پہلو (انذار، تنذیر) کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا کے حوالے سے قرآنِ حکیم میں مسلسل آیا ہے اور سیاق و سباق کی تبدیلی کے ساتھ تنذیر کے مفہوم و معانی کی ایک دنیا ہمارے سامنے آتی چلی جاتی ہے۔ چند مقامات پیش کئے جاتے ہیں تاکہ یہ نکتہ قارئین پر واضح ہو سکے۔ اختصار اور اپنی تنگ دامانی کی وجہ سے تفاصیل کو پیش کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔

اَوَ لَمْ يَتَفَكَّرُوْا ^سکتہ^ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ (۱۰)

اور کیا اِن لوگوں نے کبھی سوچا نہیں کہ اِن کے رفیق پر جنون کا کوئی اثر نہیں ہے۔ وہ تو صاف صاف انداز میں (ان کے غلط اسلوبِ حیات اور برے انجام پر) ڈرانے والا اور آگاہ کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انبیائے کرام کو اُن کی قوموں ہی میں پیدا کیا اور مبعوث فرمایا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی قریش میں پیدا ہوئے اور قریش ہی آپ ﷺ کے مخاطبِ اوّل تھے (اور پھر آپ ﷺ کے پیغام نے ہر زماں . اور ہر مکان اور ہر قوم کو اپنے دائرے میں لے لیا)۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اُن کی قوم نے امین کہا، صادق کہا، اُن کی قوتِ فیصلہ اور انصاف کے پیشِ نظر اُن کو اپنا حَکم بنایا، لیکن جب آپ ﷺ نے توحید، مساوات اور آخرت کی تعلیمات پیش کیں تو آپ ﷺ کو مجنوں کہنے لگے اور یہ بات مطلق فراموش کر دی کہ یہی وہ آنکھ ہے جو اُن کے لئے راتوں کو جاگتی اور اُن کی ہدایت کے لئے آنسو بہاتی ہے، یہی وہ قلب ہے جو اُن کے لئے محبت اور ہمدردی کا سمندر ہے۔ اِس رشتے کو قرآنِ حکیم نے ایک لفظ کے ذریعے پیش کر دیا۔ ''صاحب''۔ اِس لفظ کے مادہ ''ص ح ب'' میں مستقل وابستگی اور ساتھ رہنے کا مفہوم بنیادی معنی کے طور پر موجود

ہے۔ اِس کے ساتھ ساتھ اِس میں زمانۂ طویل کا معنوی پہلو بھی موجود ہے۔ صاحب کے لفظ میں تکریم کا پہلو بھی موجود ہے۔ صاحب کے ساتھ مستقل طور پر رہنے والے اُس کے مصاحب، صحابی اور اصحاب کہلاتے ہیں۔ ویسے قواعد کے طور پر اصحاب کا لفظ صاحب کی جمع ہے، لیکن جب صاحب واحد استعمال ہوتا ہے تو اِس کے معانی میں تعظیم کا رُخ نمایاں ہو جاتا ہے۔(۱۱)

ہر رسول اپنی قوم کی ہمدردی اور محبت کی مثال ہوتا ہے، اور اِسی ہمدردی اور محبت کے تقاضے کے طور پر وہ وحی الٰہی کی روشنی میں اپنی قوم کو اُن کے اعمال کے نتیجے میں خبردار کرتا ہے اور خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے تنبیہ میں تو اُن کے قلب کی شفقت اور ہمدردی کے ساتھ اِس کائنات کی شہادت بھی شامل تھی۔ آپ نے قریش کو دعوت دی کہ ذرا زمین و آسمان کے نظم پر غور کرو، تخلیقات کے تنوع کو دیکھو، مناظرِ حیات و کائنات پر نظر ڈالو۔ اِن میں سے ہر چیز رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثِ تنذیر کی شہادت ہے:

اَوَ لَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْ ءٍ وَّ اَنْ عَسٰۤی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُھُمْ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَہٗ یُؤْمِنُوْنَ ۝ (۱۲)

کیا انہوں نے نظر نہیں کی (ہماری) آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں اور جو کچھ پیدا کیا ہے اللہ نے ہر چیز سے، اور کیا انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ شاید قریب آ گیا ہو اُن کی مہلت زندگی پوری کرنے کا وقت۔ اور پھر رسول ﷺ کی اِس تنبیہ کے بعد وہ کون سی بات ہو سکتی ہے جس پر یہ ایمان لائیں۔

اِس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو دلیلیں قائم فرمائی ہیں۔ اور دو حقائق پر غور و فکر کی دعوت دی گئی ہے۔

اوّل اللہ تعالیٰ کی مخلوقاتِ آسمان و زمین اور اُن کے درمیان کی بے شمار مصنوعاتِ عجیبہ میں غور و فکر، دوسرے اپنی مدتِ عمر اور فرصتِ عمل پر نظر۔

ذرا گہری نظر کرنے والے کے لئے تو عالم کا ذرہ ذرہ قادرِ مطلق اور حکیمِ مطلق کی حمد و ثنا کا تسبیح خواں نظر آنے لگتا ہے۔ اور اپنی مدتِ عمر میں غور و فکر کا یہ نتیجہ ہے کہ جب آدمی یہ سمجھ لے کہ موت کا وقت معلوم نہیں کب آ جائے تو ضروری کاموں کے پورا کرنے میں غفلت سے باز آ جاتا ہے۔ موت کا استحضار ہی وہ چیز ہے جو انسان کو بہت سے جرائم سے بچنے پر آمادہ کر دیتی ہے۔(۱۳)

اِن دو آیات سے نذیر مبین صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق انذار سامنے آجاتا ہے۔ آپ کا ڈرانا، قوم کے لئے آپ کی انتہائی شفقت اور محبت کا نتیجہ ہے اور یہ شفقت آپ کے انداز سے پوری طرح آشکار ہے۔ وہ اسلوب اور انداز جو آپ ﷺ کے رب نے آپ کو عطا کیا وہ قرآنِ حکیم کے اُس اسلوب کا حصہ ہے جس کو جامعیت سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور جس میں کلام و استدلال کا ہر وہ رنگ موجود ہے جو انسانوں کو اور اُن کے فکر و نظر کی دنیا کو بدل سکتا ہے، کیونکہ انسان کے خالق سے زیادہ انسان کو کون سمجھ سکتا ہے۔

قرآنِ مُبین میں نذیر کے ساتھ مُبین کی صفت دس آیات میں استعمال ہوئی ہے۔(۱۴) قرآنِ کریم سے ہر حقیقت واضح ہو کر اور کُھل کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ حق و باطل کے درمیان کوئی شبہ اور شک باقی نہیں رہتا۔ بیان کے معانی ہیں کسی چیز کا واضح ہو کر سامنے آجانا، ہر اہم پہلو کا کُھل جانا۔ قرآنِ مجید کتابُ مبُین ہے۔ جس نے ہر حقیقت کو انسان کے سامنے پیش فرمادیا۔ وہ حقائق بھی جو انسان کے علم، ادراک اور احساس سے ماورا ہیں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم (اور دوسرے انبیائے کرام) نے وحی الٰہی کی روشنی میں اٹل اور محکم حقائق سے انسان کو روشناس کیا۔ رسولِ مُبین، کتابِ مُبین لے کر آیا اور ہمارے ذکر و فکر، ذہن و عمل کی راہیں واضح ہو کر سامنے آ گئیں اور یوں ہی قیامت تک روشن رہیں گی۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں حقائق کی یہ وضاحت اُن کے کردار کی شفقت سے ہم آہنگ ہو گئی۔

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ○ (۱۵)

اور اپنے بازوؤں کو اہلِ ایمان کے لئے بچھا دیجئے اور کہہ دیجئے کہ میں تو صاف صاف انداز میں تنبیہ کرنے اور خبردار کرنے والا ہوں۔

''وَاخفض جناحک'' یہ اہلِ عرب کا محاورہ ہے۔ قرآنِ حکیم کے اِن الفاظ کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا گیا ہے کہ ''اپنے آپ کو جُھکا دیجئے۔'' ہم نے مفہوم کی ادائیگی کے لئے ''جناح'' کے لفظ کو اہمیت دی ہے۔ جناح ہاتھ، بازو اور پرندے کے بازو اور پر کو کہتے ہیں۔ پرندے اور بالخصوص مُرغی خطرے کے وقت اپنے بچوں کو پروں میں سمیٹ لیتی ہے۔ پر اور بازو حفاظت اور تحفظ کی علامتیں ہیں۔ ''انت فی جناحی'' اگر کوئی یہ بات دوسرے سے کہے تو اس کا مفہوم یہی ہوگا کہ ''تم میری حفاظت میں ہو۔'' لفظی ترجمہ تو یہ ہوگا کہ تم میرے پروں پر ہو۔ قرآن حکیم کے

ان لفظوں میں نبی اور اُمت کا رشتہ سمٹ آیا ہے۔ ایک اور بات بھی سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ نبی کی تنذیر مسلمانوں کی حفاظت کا وسیلہ اور ذریعہ ہے۔ وہ اپنے تنبہ کے ذریعے اہل ایمان کو دُنیا کی رسوائی اور آخرت کے عذاب سے بچالیتا ہے اور حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو ساری انسانیت کے لئے اور سارے زمانوں کے لئے نذیر مبین بنا کر بھیجے گئے۔ رسالت اُن پر ختم ہوئی، اللہ کا آخری پیغام قرآنِ حکیم کی صورت میں محفوظ ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کی زبان سے انسانیت کے نام اپنے اِس پیغام کو قرآنِ حکیم کے ذریعے محفوظ فرمادیا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ (۱۶)

اے رسول کہہ دو کہ اے انسانو! میں تو تمہارے لئے نذیر مبین ہوں۔ کھول کر اور واضح طور پر ڈرانے والا۔

نذیر کی مکمل معنویت اِس سیاق و سباق میں اُبھر کر سامنے آتی ہے کہ رسول کا کام غلط اندازِ زندگی پر متنبہ کرنا ہے اور عذاب نازل کرنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ نافرمان اور سرکش قومیں اپنے رسولوں سے عذاب نازل کرنے کی فرمائشیں کرتی تھیں اور یہ تمسخر و استہزا اُن کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا، خود قریش مکہ ٹھٹھول کرتے اور رحمۃ للعالمین ﷺ سے کہتے کہ تمہارا وہ عذاب کہاں ہے جس سے تم ہمیں ڈراتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے خاتم المرسلین کے انسانیت کے لئے نذیر مبین ہونے کے اِس ''اعلان'' سے پہلے آیت نمبر ۴۲ سے آیت نمبر ۴۸ تک ایک ایسا منظر نامہ پیش فرمایا ہے کہ نبوت اور منکرینِ نبوت کی ساری تاریخ اُس میں سمٹ آتی ہے۔ مشرکین مکہ اپنے تجارتی سفر میں ماضی کی معذب بستیوں سے گزرتے تھے، مگر اِس دنیا میں اِس درجہ غرق اور گم تھے کہ ہدایت و عبرت کے نشانات اُن پر روشن ہی نہیں ہوتے تھے۔ اب ذرا یہ جاوداں تصویر ملاحظہ ہو:

وَاِنْ يُّكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ ○ وَقَوْمُ اِبْرَاهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ ○ وَاَصْحٰبُ مَدْيَنَ وَكُذِّبَ مُوْسٰى فَأَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ فَكَيْفَ كَانَ نَكِيْرِ ○ فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّ قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ○ أَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ

وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ ○ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ
بِالْعَذَابِ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ
مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ○ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْ
تُهَا وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ ○ (۱۷)

اور اے رسول! اگر یہ آپ کی تکذیب کریں اور آپ کو جھٹلائیں تو اِن سے پہلے نوحؑ، عاد اور ثمود کی قومیں اور ابراہیمؑ اور لوطؑ کی قومیں اور مدین کے لوگ اپنے رسولوں کی تکذیب کر چکے ہیں (اور مصر کے قبطیوں نے) موسیٰؑ کی تکذیب کی۔ پر میں نے منکروں کو ڈھیل دی اور پھر ان کو پکڑ لیا، تو کیا ہوا، اور کیا حشر ہوا منکروں کا۔ کتنی ہی خطاکار بستیاں تھیں جنہیں ہم نے تباہ (اور تہ وبالا) کر دیا، اور آج وہ اپنی چھتوں پر الٹی پڑی ہیں، کتنے ہی کنوئیں بیکار اور کتنے ہی قصر کھنڈر بنے ہوئے ہیں۔ (۱۸) کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں (کیا انہوں نے اللہ کی زمین پر مشاہدہ نہیں کیا) کہ اِن کے دل سمجھنے والے یا ان کے کان سننے والے ہوتے (اور اِن نشانیوں سے وہ سچ کے سامنے اپنے آپ کو جھکا دیتے) حقیقت یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

اے نبی! یہ لوگ (تمسخر کرتے ہوئے) عذاب کے لئے جلدی مچا رہے ہیں۔ اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا (عذاب اپنے وقت پر آکر رہے گا)، مگر تمہارے رب کے ہاں ایک دن تمہارے شمار کے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ کتنی ہی بستیاں ہیں جو گنہ گار اور ظالم تھیں، میں نے پہلے انہیں مہلت دی اور پھر انہیں پکڑ لیا اور سب کو واپس تو میرے پاس ہی آنا ہے۔

اور اقوامِ سابقہ کے اِس ذکر کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نذیرِ مُبین ہونے کا اعلان انہیں کی زبانی اللہ تعالیٰ نے کرایا۔ قریش اپنے مال و متاع، اپنے بازاروں، اپنے میلوں اور اجتماع گاہوں کی رونقوں پر نازاں تھے۔ لمحۂ موجود کی چمک دمک نے اُن کے سینوں کو بے نور اور دلوں کو اندھا کر دیا تھا۔ اور اُن میں اتنا شعور کہاں تھا کہ وہ سمجھ سکتے کہ قیامت کا ایک دن اپنے شدائد

اور ہول ناکیوں میں ہزار سال کے برابر ہوگا۔

اس تنذیر کا دامن تبشیر سے بندھا ہوا ہے۔ وہ جو حقائق کو دیکھ سکیں، تاریخ کی شاہراہ پر اپنے پیش رووں کے نقوشِ پا اور انجامِ سفر سے عبرت حاصل کر سکیں، اُن کے لئے مغفرت بھی ہے اور رزقِ کریم بھی۔ ہم یہ بات پہلے عرض کر چکے ہیں کہ ”خوش خبری سے پہلے ڈراوٗ یہ منطقی ترتیب ہے۔ ایک نئے طرزِ حیات کو اپنانے اور نئے تصورات کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے سے پہلے یہ لازم ہے کہ آدمی اپنی غلط روشِ زندگی سے نجات پالے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نذیرِ مبین ہونے کے اعلان سے پہلے تباہ شدہ بستیوں اور محلوں کا ذکر کیا گیا۔ اور آپ کو خبردار اور آگاہ کرنے والا کہنے کے بعد فرمایا گیا:

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِیْمٌ۝ وَالَّذِیْنَ سَعَوْا فِیْٓ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیْنَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِیْمِ۝ (۱۹)

پھر جو ایمان لائیں گے اور اعمالِ صالحہ کو اپنائیں گے اُن کے لئے مغفرت (بھی ہے اور رزقِ کریم بھی) اور جو ہماری آیات کو نیچا دکھانے کی اور پست کرنے کی کوشش کریں گے وہی جہنم والے ہیں۔

نذیر کو قرآنِ حکیم نے تنذِر بھی کہا ہے۔ اِن کے معانی میں نازک سا فرق ہے۔ ابواب کی تبدیلی سے لون معنوی (Shade of Meaning) میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

نذیر میں شدت اور تواتر کا مفہوم موجود ہے۔ وہ جو مسلسل تنبیہ اور آگاہ کرنے کا فریضہ انجام دے نذیر ہے اور جس کے عملِ تنذیر میں یہ شدت اور تواتر نہ ہو وہ منذر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ویسے ایک ہی رسول کو نذیر بھی کہا گیا ہے اور منذر بھی۔ جس طرح بشیر کہا گیا ہے۔ اور مبشر بھی۔ ویسے عام طور پر صوتی آہنگ کی بنا پر نذیر کے ساتھ بشیر آتا ہے اور منذر کے ساتھ مُبشر

:

تَقُوْلُوْا مَا جَآءَنَا مِنْۢ بَشِیْرٍ وَّ لَا نَذِیْرٍ ۔ (۲۰)

اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ ۔ (۲۱)

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا (۲۲)

لیکن یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔ نذیر کے ساتھ قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر مبشر بھی آیا ہے۔ (۲۳) قرآن اُس ذات کا کلام ہے کہ ہر اسلوب، ہر آہنگ اُس کے ارادے کے تحت ہے۔

تنذیر پر اِس مختصر گفتگو کے بعد ہم اب نبیٔ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مرتبہ بلند کے اس پہلو کی طرف آتے ہیں جسے تبشیر اور بشارت کہتے ہیں۔

بشارت کا لفظ بالعموم اچھی خبر کے لئے استعمال ہوتا ہے، ویسے تو قرآنِ کریم میں یہ لفظ عذاب کی خبر کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِیْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِیْمَا ۝ (۲۴)

منافقون کو مژدہ سنادیجئے کہ اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔

یہاں بشارت کے لفظ کی بلاغت اور کاٹ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کی ایک دلیل ہے۔ منافق اپنے طرزِ حیات کے سب سے بڑے شاہد تھے۔ اُن کا دوُرخاپن دوسروں سے کہیں زیادہ خود اُن پر روشن تھا اِسی لئے بشارت کے لفظ کے ذریعے انہیں آئینہ دکھایا گیاہے۔ کہ منافقت عذابِ الیم کی بنیاد ہے۔ منافقین کی منافقت کا سبب کیا تھا؟ اِس کا سبب اگلی آیت ہی میں دیدیا گیا ہے کہ یہ مسلمانوں کو چھوڑ کر عزت حاصل کرنے کے فریب میں کافروں کو اپنا رفیق بناتے ہیں، مگر عزت تو صرف اللہ کے لئے ہے۔ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا ۔ اور اُن کے لئے جو اللہ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بشارت (وعید) سُن کر منافقین کے چہروں کی رنگت بدل گئی ہوگی۔ خوشی کی خبر سن کر مومنوں کے چہرے دمک اُٹھتے تھے اور اِن چمکتے چہروں کا ذکر دنیا اور آخر دونوں کے سیاق و سباق میں قرآنِ حکیم میں کئی مقامات پر کیا گیاہے۔ اللہ کے رسولوں اور بالخصوص رسولِ آخرالزماں اور نبیٔ انسانیت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مومنوں کو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے اجر کے طور پر جنت کی بشارت دی، اللہ اور رسول نے صابرین اور شہدا کو حیاتِ جاوداں اور ہمیشہ جاری رہنے والے رزق کی بشارت دی، آپ ﷺ نے بشارت دی کہ دنیا اور آخرت کی ہر خوشگواری اور نعمت اُن کے لئے ہے جو منکرات سے رُک جاتے ہیں اور حدود اللہ کی محافظت کرتے ہیں، اللہ اور رسول نے مومنوں کو فضلِ کبیر کی بشارت دی اور یہ بشارت دی کہ تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔

چودہ سو سال کی تاریخ اِن بشارتوں کی صداقت کی گواہی ہے۔

فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِیْعًا کی تفہیم نے مسلمانوں کو اقوامِ عالم کی قیادت و امامت عطا کی اور

جب ہم عزت کے مفہوم سے بے خبر ہو کر کافروں کی رفاقت میں حفاظت اور عزت تلاش کرنے لگے تو آج ہماری یہ کیفیت ہے کہ باغ عالم میں ہم خزاں زدہ پتوں کی طرح اُڑتے پھر رہے ہیں، اور کافروں کے معاہدے ہمیں اعتبار کی سند معلوم ہونے لگے ہیں، اور اس بات پر بھی ناز کرتے ہیں کہ اب ہمیں نادہندہ (Defaulter) قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ہے وہ غلامی جس میں ہم نام نہاد سیاسی آزادی کے باوصف گرفتار ہیں اور یہ آیتِ کریمہ بھی آج ہم پر اپنے معانی کے دروازے نہیں کھولتی کہ

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ (۲۵)

عزت تو صرف اللہ اور اُس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔

اور اس کے فوراً بعد فرمایا گیا کہ

وَلٰـكِنَّ المنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَهُوْنَ ۔ (۲۶)

لیکن منافقین اِس حقیقت کو نہیں سمجھتے۔

اس وقت میرے قلم پر لرزہ طاری ہے کہ کیا اس وضاحت کے مطابق ہم نفاق کے عذاب میں گرفتار نہیں ہیں؟

عزت کے مفہوم میں قوت اور غلبہ بھی شامل ہے۔ غلبے کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے اور اِسے ہم ''نوالۂ گدا'' سمجھنے لگے ہیں۔ کیا اللہ کی ناخوشی کی قیمت پر کسی کی فوجی امداد ہمیں صاحبِ قوت بنا سکتی ہے؟ ہماری موجودہ ذلت، بے بسی، ناتوانی۔ سب کچھ حضرتِ فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اِس فقرے میں سمٹ آئی ہے۔

مَنْ اِعْتَزَّ بِالْعَبِیدِ اَذَلَّـهُ اللّٰهُ ۔ (۲۷)

جو بے بس اور حقیر بندوں کے ذریعے عزت حاصل کرنا چاہے اللہ تعالیٰ اُسے ذلیل کر دیتا ہے۔

نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعتِ مومنین کو اِس دنیا اور آنے والی دنیا کی خوشگواریوں، کامیابیوں اور کامرانیوں کی بشارت دی۔ اِس سے بڑی بشارت اور کیا ہو سکتی ہے کہ اِس دُنیا کی زندگی کا تسلسل کبھی ختم نہ ہونے والی زندگی تک جا پہنچے۔ اِس دنیا میں آدمی اپنے آپ سے مطمئن ہو، دوسرے انسانوں کے لئے جس کے موسم میں موجِ نسیم بن جائے، اِس کائنات کے ہر ذرے کے لئے رحمت کا سبب بنے اور اپنے خالق سے اُس کا وہ رشتہ قائم ہو جائے کہ وہ محسوس بھی ہو

اور معلوم کے دائرے میں بھی آ جائے۔ ہمارے دور میں مستقبلیات (Futuristics) کو ایک باضابطہ علم کا درجہ حاصل ہو چکا ہے اور مستقبلیات کو ہماری دنیاوی زندگی کا حصہ بنا دینا حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے عظیم ترین معجزوں میں سے ہے۔ اُن ﷺ کے رب نے اُن کی زندگی کے ہر لمحے اور پہلو کو ایک معجزہ بنا دیا۔ ایسا معجزہ جو رواں دواں ہے اور ایک عہد سے دوسرے عہد تک پہنچتا ہے۔ زیادہ درخشاں اور تابناک ہو کر، جنت اِسی دنیا کا تسلسل اور اِسی زندگی کا تکملہ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی بشارت، جس نے مومن کی موت کو بھی دیباچہ حیات و نشاطِ ابد بنا دیا:

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۲۸)

اے رسول ﷺ! اُن لوگوں کو بشارت دیجئے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اعمالِ صالحہ کو اپنایا کہ اُن کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ ان باغوں کے پھل صورت میں دنیا کے پھلوں سے ملتے جلتے ہوں گے، جب کوئی پھل انہیں کھانے کے لئے دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ ایسے ہی پھل اِس سے پہلے (دنیا میں) ہمیں عطا ہوئے تھے اور اُن کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں (اور جوڑے) ہوں گے اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

اِس بشارت میں جیسا کہ عرض کیا گیا زندگی کا تسلسل اہمیت رکھتا ہے۔ اعمالِ صالحہ کا اجر ہمیشہ کی فردوسی زندگی ہے۔ اور اِس تسلسل کی نشانیاں کیسی گوناگوں ہیں۔ وہ پھل جو اِس دنیا کے پھلوں کے مشابہ ہوں گے لیکن جن کی لذت اُس "جنتِ خُلد" کے مزوں کی ہم طرح ہو گی۔ یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ جنت کی فضا اور لذتوں کی تکمیل پاکیزہ بیویوں سے ہوتی ہے۔ یہ وہ بیویاں ہیں جو اِس دنیا میں بھی اسلامی معاشرے کو جنت کی مثال بناتی ہیں۔ یہ وہ بیویاں ہیں جو اِس دنیا میں اپنے شوہروں کی عصمت قلب و نظر کا سبب بنتی ہیں، اسلامی معاشرے کی تعمیر کرتی ہیں اور یوں وہ بشارت کا درجہ رکھتی ہیں۔ اِسی پس منظر میں درج ذیل آیت کے معانی ہم پر کھلتے ہیں اور یہ بات سمجھ میں

آجاتی ہے کہ عورتوں اور اولاد کے ذکر کے بعد مومنوں کو فلاح کی نوید کیوں دی گئی ہے۔

نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَأْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ وَاتَّقُوْا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ O (۲۹)

تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ جس طرح چاہو اپنی کھیتوں میں جاؤ، مگر اپنے مستقبل (کی) فکر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ تمہیں (ایک دن) اُس سے ملنا ہے۔ (اور اے رسول ﷺ) اہلِ ایمان کو (سعادتوں کی) بشارت دو۔

جنس اُن لذتوں میں سے ایک ہے جو بہت سے انسانوں کو بے لگام کر دیتی ہیں اور وہ فکر و تامل سے بے بہرہ ہو جاتے ہیں۔ دنیا میں جرائم کی اکثریت کا تعلق جنس سے ہے۔ شراب اور دوسری گم راہیاں جنسی لذتوں کے جلو میں آتی ہیں۔ پھر عورت سے جنسی تعلقات بہت سے لوگوں کے لئے سب کچھ بن جاتے ہیں۔ نت نئے تجربے، تنوع، آزار پسندی اور آزار طلبی۔ آج کے ماحول میں یہ تفاصیل معلوم اور عام ہیں۔ اسلام میں عورت تفریحی کھلونا نہیں ہے۔ بلکہ مرد و عورت کا جنسی تعلق ایک بڑا مقصد رکھتا ہے اور وہ ہے نسل انسانی کا تسلسل۔ انسانی معاشرے میں اصل ذمہ داریاں تو اولاد کی پیدائش کے بعد شروع ہوتی ہیں۔ اولاد کو رزقِ حلال پر پالنا، اولاد کی تربیت، تعلیم اور نگہبانی، اور مستقبل کی فکر میں یہ سارے پہلو سمٹ آئے ہیں۔ اس میں یہ مفہوم پوری طرح شامل ہے کہ تم جس نسل کو اپنے بعد اِس کرۂ ارض پر چھوڑ جاؤ وہ ہر اعتبار سے انسانیت کے کارواں کو عافیت کے راستوں پر آگے بڑھا سکے۔ اور یوں ایسے لوگ بشارت کے مستحق ہیں جو انسانیت کے مستقبل کو محفوظ تر بناتے ہیں اور ایسی نسلوں کو اپنا وارث بناتے ہیں جو اعلیٰ اقدارِ حیات کی نمائندہ بن سکیں۔

بشارت مومنوں کے لئے ہے۔ مومن وہ ہیں جو ایمان لائے، جو نیک اعمال کرتے ہیں جو اپنے سینے میں اپنے اور انسانیت کے مفادات کا غم رکھتے ہیں، اور پھر بشارت کے سلسلے ہی میں مومنوں کے اوصاف بیان کئے گئے، واضح رہے کہ یہ اوصاف اُن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور اُن کے فیضِ صحبت نے پیدا کئے ہیں۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور وابستگی نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کو انبیائے کرام علیہم السلام کے بعد انسانی تاریخ کا سب سے برگزیدہ طبقہ بنا دیا۔ اور اُن کا پرتو ہمیں تابعین، تبع تابعین اور صلحائے اُمت کی زندگیوں میں ملتا

ہے۔ یہ ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کھیتی جو قیامت تک لہلہاتی رہے گی اور جس کی نئی فصلیں انسانیت کی سرخروی اور سیرابی کا سامان بہم پہنچاتی رہیں گی۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ (۳۰)

اللہ کی طرف بار بار پلٹنے اور توبہ کرنے والے، اُس کی عبادت کرنے والے، اُس کی حمد کرنے والے، اس کی خاطر زمین میں گھومنے والے، معروف کا حکم دینے والے، بدی اور منکر سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے۔ اور اے نبی ﷺ! اِن مومنوں کو (ہر فلاح و سعادت کی) بشارت دیدیجئے۔

انہیں مومنوں کے سلسلے میں اس سے پہلی آیت (۳۱) میں فرمایا گیا کہ:

اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اُن کے جان (نفس) اور مال جنت کے عوض خرید لئے۔ وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں، قتل ہوتے ہیں، اور قتل کرتے ہیں، اُن کے لئے جنت کا وعدہ اللہ تعالیٰ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے، تورات میں، انجیل میں اور قرآن میں۔

توبہ کی یہ توفیق، اللہ کی عبادت اور حمد کا یہ ذوق، اُن کا جہاد فی سبیل اللہ اور حصولِ علم کے لئے جذبۂ سیاحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی پاس داری اور حدود اللہ کی حفاظت کے لئے اُن کی چوکسی۔ یہ سب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت کا عکس تھا اور آج بھی کتاب اللہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے اقوال واعمال کے عکس سے ہماری زندگی میں یہ رنگ اُبھرتے ہیں۔ یہ ہے خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے جاری و ساری ہونے کا ایک پہلو، اور یہ مقامِ محمدی ابدی، جاوداں اور مسلسل ہے۔ ہمارے مولا اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کو اِس باب میں کتنا حساس بنادیا تھا اور کس طرح حدود اللہ کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نفس اور کردار کی حفاظت کرتے تھے اُس کا اندازہ حدیث حنظلہ سے ہو سکتا ہے:

حضرت حنظلہ بن ربیع الاسیدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن مجھے ابو بکر (رضی اللہ عنہ) ملے اور انہوں نے دریافت فرمایا "حنظلہ کیا حال ہے؟" میں نے اُن سے کہا "حنظلہ

منافق ہو گیا" انہوں نے فرمایا "سبحان اللہ۔ تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔" میں نے جواب دیا "جب ہم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں ہوتے ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوزخ اور جنت کا ذکر کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم دوزخ اور جنت کو آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔ پھر جب ہم آپ کی مجلس سے نکل کر گھر آجاتے ہیں تو بیوی بچے، زمین اور کاشتکاری کی مصروفیات میں کھو جاتے ہیں اور پھر ہم بہت کچھ بھول جاتے ہیں۔" حضرت ابو بکرؓ نے یہ سن کر فرمایا "یہ کیفیت تو ہماری بھی ہو جاتی ہے۔" اس کے بعد (حضرت) ابو بکر اور میں، دونوں چل دیئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور میں نے عرض کیا یارسول اللہ! حنظلہ منافق ہو گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا "وہ کیسے؟" میں نے عرض کیا "صورتِ حال یہ ہے کہ ہم آپ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ جب ہمیں دوزخ اور جنت کا حال سنا کر نصیحت کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ اور جنت ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور جب آپ کی مجلس سے نکل کر ہم گھر جاتے ہیں تو بیوی بچوں اور کھیتی باڑی اور دنیا کے مشاغل میں کھو جاتے ہیں اور سب کچھ بھول جاتے ہیں۔" یہ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، اگر ہمیشہ تمہارا وہی حال رہے جو میری محفل اور صحبت میں ہوتا ہے اور تم ہمیشہ ذکر میں مشغول رہو تو فرشتے تمہارے بستروں میں اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کیا کریں، لیکن اے حنظلہ! یہ کافی ہے کہ یہ کیفیت وقتاً فوقتاً رہا کرے۔" اور یہ بات آپ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ (۳۲)

"تائبون" یعنی توبہ کرنے والے۔ اِس سے مراد یہ ہے کہ مومن بار بار اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اللہ ہی اُن کی پناہ گاہ ہے جس کی طرف وہ لوٹ کر آتے ہیں۔ بشریت کے تقاضوں کے تحت ہم اللہ سے اپنے رشتے کی گہرائیوں اور اپنے فرائض کو وقتی طور پر بھول جاتے ہیں، لیکن پھر ایمان ہمیں بارگاہِ صمدیت میں توبہ اور ندامت کے ساتھ واپس لے جاتا ہے۔ ہماری ہر لغزش توبہ کے سانچے میں ڈھل کر ہماری باز آفرینی کا سبب بنتی ہے۔ "یعنی بار بار کی توبہ اور یہی رہ رہ کر خدا کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد وفاداری کی راہ پر واپس آنا ہی ایمان کے دوام و ثبات کا ضامن ہے۔ (۳۳)

ہر بشارت اُن مومنوں کے لئے ہے جن کا ہر قدم دین کی سربلندی اور جہاد کے لئے گھر سے نکلتا ہے سائحون۔ یہ لفظ سیاحت سے ماخوذ ہے، مگر بیشتر مفسرین کا قول ہے کہ سائحون کا لفظ صائمون یعنی روزہ داروں کے لئے استعمال ہوا ہے، لیکن بعض روایتوں میں اس کا مفہوم جہاد

بھی بتایا گیا ہے اور ہم نے اِسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔" ابن ماجہ، حاکم، بیہقی نے بسندِ صحیح روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

سَیاحۃُ اُمتی الجھاد فی سبیل اللّٰہ۔ (۳۴)

یعنی اس امت کی سیاحت جہاد فی سبیل اللہ ہے،(۳۵)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتیں رجوع کرنے والوں، حمد کرنے والوں، جہاد کرنے والوں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اپنانے والوں کے لئے ہیں اور یہ تمام خصوصیات حدود اللہ کی اطاعت کرنے والوں میں سمٹ آتی ہیں۔ الحفظون لحدود اللہ۔ مسلمان کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، اُس کی سیاست ہو یا معیشت، اُس کا نظامِ اقدار ہو یا سلسلۂ عبادات، اُس کا اخلاق ہو یا معاشرت، بات چھوٹی ہو یا بڑی وہ اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود اور ضابطوں کو اپنے عمل کے ذریعے مستحکم کرتا ہے اور یوں کہ اُس کے عمل سے حدود اللہ کا خاکہ نگاہوں کے سامنے اُبھر کر آجاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ہر لمحہ حفاظت حدود اللہ کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ حج وداع، حدود اللہ کی حرمت اور تکمیل و تعمیل کا نقطہ تھا کہ کارِ رسالت مکمل ہو چکا تھا۔ خطبہ ءِ حجۃ الوداع میں آپ ﷺ نے اسلام کی بنیادوں کو واضح کیا اور شرک و جہالت کی بنیادیں منہدم کر دیں۔ ناحق خون کرنا، مال غصب کرنا اور آبرو ریزی کرنا، جہالت کی تمام باتوں اور مروجہ کاموں کو اپنے قدموں کے نیچے پامال کر دیا، جہالت کا سود کل کا کل آپ ﷺ نے ختم فرما دیا۔ عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کی۔ اُمت کو آپ نے کتاب اللہ کے ساتھ مضبوطی سے وابستہ رہنے کی وصیت کی۔ آپ نے لوگوں کو یہ بھی تلقین فرمائی کہ دیکھو میرے بعد کافروں کی طرح نہ ہو جانا جو ایک دوسرے کی گردن مارتے رہتے ہیں۔ خبردار ظلم نہ کرنا۔ کسی مسلمان کے مال میں سے کچھ لینا جائز نہیں۔ جس کے پاس کوئی امانت ہو وہ صاحبِ امانت کو واپس کر دے۔(۳۶) نہایت اختصار کے ساتھ حجۃ الوداع کے حوالے سے حدود اللہ کا ذکر کیا گیا، ورنہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً حدود اللہ کی جس طرح حفاظت کی وہ خود ایک مستقل کتاب کا موضوع ہے۔ نبی برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر یہ بات اپنے عمل سے واضح فرما دی کہ بشارت کے مستحق مومن اللہ کی حدود کی حفاظت خود بھی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی کراتے ہیں اور یوں وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جو حدود اللہ کا اجتماعی نمونہ ہوتا ہے۔

انذار اور تبشیر کے ذکر کے ساتھ قرآنِ حکیم نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ رسول،

ہمیشہ انسان ہوتا ہے۔ وہ انسان جو اپنے معاشرے کے ہر مرض سے باخبر ہوتا ہے اور جس کا وجود اللہ کی عظمت و کبریائی کی پہلی شہادت ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے معاشرے کے مصائب، کمزوریوں اور تمام رجحانات سے بالاتر اور پاک ہوتا ہے اور جس کا ہر قول وحیِ الٰہی کی روشنی سے منور ہوتا ہے اور معاشرے کو بھی روشن کرتا ہے۔ لیکن انسانوں نے ہر دور میں، جب تک سلسلۂ رسالت جاری رہا، اس بات پر تعجب کا اظہار کیا کہ یہ کیسے رسول ہیں جو بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، حوائجِ ضروریہ سے بالاتر نہیں، فقر و فاقہ کرتے ہیں، عام انسانوں کی طرح بیمار پڑتے ہیں، اور تو اور بسا اوقات دوسروں سے قرض بھی لیتے ہیں، بات یہ ہے کہ یہ منکر اور کافر منصبِ رسالت سے بے خبر تھے، رشد و ہدایت سے انہیں کوئی واسطہ نہ تھا، وہ سحر، بازی گری اور فریبِ نظر کو انتہائے کمالِ انسانیت سمجھتے تھے۔ وہ تو اُس کلام کی ماہیت کو بھی سمجھنے سے قاصر تھے جو اُن کی ہدایت کے لئے رسولوں پر نازل ہوتا تھا۔ اور بالخصوص قرآنِ حکیم جو لوگوں کو حکمت و دانش کی حقیقتوں سے آشنا کرنے کے لئے نازل ہوا۔ وہ حکمت و دانش جس کو اپنانے والوں نے صدیوں کا سفر برسوں میں طے کیا۔

الٓرٰ۔ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ○ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۔ قَالَ الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ○ (۳۷)

ال ر۔ یہ کتابِ حکمت و دانش کی آیات ہیں، کیا لوگوں کے لئے یہ (بہت) عجیب بات ہے کہ ہم نے انہیں میں سے ایک آدمی کی طرف وحی بھیجی کہ وہ (غافلوں کو) تنبیہ کرے اور (اُن کے نتائجِ اعمال سے) ڈرائے اور ایمان والوں کو بشارت دے۔ کہ اپنے رب کے ہاں اُن کا پایہ سچا ہے (اور ان کے لئے سچی عزت اور سرفرازی ہے اور اس وحی و صداقت سے بھاگنے کے لئے) کافر کہنے لگے کہ یہ تو صریح اور کھلا ساحر اور جادوگر ہے۔

رسول کی بشریت کو قرآنِ حکیم نے بارہا پیش کیا ہے، اور مختلف سیاق و سباق میں اس طرح کہ اس بشریت کے مختلف پہلو ابھر آئیں۔ یہاں الر، حروفِ مقطعات کے بعد یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے۔ حروفِ مقطعات اللہ اور رسول کے درمیان رمز بندی اور رمز کشائی (Encoding Decoding) کی ایک صورت ہیں اور اہلِ ایمان کے لئے افزائشِ ایمان کی ایک سورت، انتہا یہ

کہ قرآنِ حکیم کا آغاز ہی الم سے ہوا اور ان پر ایمان کی بنیاد پر ہمارے اسلام کی بنیاد قائم ہے۔ حروفِ مقطعات کی تعبیریں اور تفسیریں موجود ہیں، مگر ہمارے ایمان کو اُن کی حاجت نہیں۔ ہاں یہ نکتہ ضرور ہمارے سامنے آتا ہے کہ ایسے اکثر مواقعات پر اللہ کی کتاب کا ذکر آتا ہے۔ یہاں بھی آیاتِ کلام اللہ کے ذکر کے بعد رسول، وحی، تنذیر اور تبشیر کا ذکر آیا ہے اور اِس نکتے کو بیان کیا گیا ہے کہ رسول کا لوگوں ہی میں سے ہونا ضروری ہے کیونکہ وہ اپنی قوم کی نفسیات، اُن کی عادات، سماجی اور ذہنی رجحانات سے پوری طرح باخبر ہوتا ہے۔ پھر اگر انسانوں کے لئے فرشتے رسول بنا کر بھیجے جاتے تو وہ انسانی تقاضوں کے سلسلے میں کس طرح اُن کی رہنمائی کر سکتے تھے۔ اور اسی کے ساتھ ساتھ اُن کے ذہنوں میں انہیں کے محاورے، اسالیبِ بیان اور قومی روایات کے پس منظر میں کس طرح نئے تصورات کو اِس طرح پیش کر سکتے تھے کہ وہ اُن کا عمل بن سکتے، بلکہ انہیں نئے نظامِ زیست کا قائد بنا دیتے۔

پھر اُن رسولوں کی زندگی انہیں لوگوں کے درمیان گزری تھی۔ وہ اُن کے کردار صدق، بے نفسی، قربانی اور ہر خوبی سے آگاہ تھے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دعویٰ نبوت کے سلسلے میں یہ بھی فرمایا تھا کہ اے لوگو! میں نے اپنی ایک عمر تمہارے درمیان گزاری ہے۔ پھر تم عقل سے کام کیوں نہیں لیتے۔ یہ آیت بھی سورۂ یونس ہی میں آتی ہے اور اِس سے قرآنِ حکیم کے نظم و ترتیب اور معنویت کے کتنے ہی باب کھلتے چلے جاتے ہیں۔ ایسے کتنے ہی مقامات اِس کتابِ ربانی میں موجود ہیں۔

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (۳۸)

اے رسول! کہہ دیجئے کہ اللہ اگر چاہتا تو میں تمہارے سامنے یہ قرآن نہ سناتا، اور تمہیں اللہ اس کی خبر تک نہ دیتا۔ آخر میں اس سے پہلے ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں، کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے اور اِس کے بارے میں بھی نہیں سوچتے۔

اس ایک آیت میں خاتم الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کی بے غبار، روشن اور کامل ترین زندگی ہی نہیں سمٹ آئی ہے بلکہ دعویٰ نبوت کے ساتھ ہی جس طرح اُن کی ذاتِ گرامی اللہ کے کلام کی ترجمان بنی، جس طرح اُن کی زبان کے مطلع سے آفاقی دانائی اور حکمت کا سورج طلوع ہوا اور

اقصائے عالم کو منور کرنے لگا، اُس کا مکمل مرقع بھی موجود ہے۔ یہ بات تو قریشِ جانتے ہی تھے کہ محمد ﷺ صادق ہیں، امین ہیں، دوسروں کے درد اور غم کا ٹھکانا اُن کا قلب ہے، وہ اپنے معاشرے کے بہی خواہ اور خیر طلب ہیں۔ اور یہ دوسرا پہلو بھی تو اُن کے سامنے تھا کہ چالیس سال کی عمر تک آپ نے ایسی باتیں کبھی نہیں کہی تھیں۔ وہ باتیں جن میں ڈراوا بھی تھا اور بشارت بھی۔ وہ باتیں جو ایک جہانِ نو کی تعمیر کی پہلی اینٹیں تھیں، وہ باتیں جن میں ایک عظیم انسانی انقلاب کی خوشبو بھی تھی اور روشنی بھی، وہ باتیں جن میں اقوامِ سابقہ کی روئداد بھی تھی، مگر وہ حیرت زدہ معاشرہ اتنی ذہنی توانائی اور اپنے معاشرے کے جاہلانہ معتقدات سے نکلنے کی ہمت سے بھی محروم تھا۔ اور پھر عظیم تر رسول اور انسان نے انہیں آیاتِ حکمت و دانش سے بیدار کیا اور انہیں اِس قابل بنایا کہ وہ اپنے نتائجِ اعمال کا تجزیہ کر سکیں۔ اور فرمان و تعلیماتِ الٰہی کے نتائج کو اللہ تعالیٰ نے یوں سمیٹ لیا۔

اَنَّ لَھُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّھِمْ ۔ (۳۹)

اپنے رب کے ہاں اُن کا پایا سچا ہے اور اُن کے لئے سچی عزت اور سرفرازی ہے۔

اِس سے مکمل، اِس سے جامع اور ہر سعادت و برکت پر محیط بشارت چھ لفظوں میں ربِ محمد ﷺ کے سوا اور کون دے سکتا ہے۔ لیکن انکار کرنے والوں نے بشیر صادق کو ''ساحر'' کہا۔ یہ کفر اور کافروں کی پراگندہ ذہنی اور انتشارِ فکر کا ثبوت ہے۔ وہ کسی ایک بات پر بھی متفق نہ ہو سکے۔ کبھی ساحر کہا، کبھی مسحور، کبھی شاعر کہا اور کبھی کاہن۔ ساحر تو نظر بندی کرتا ہے، وہ نظر کشائی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا، رسول تو بصیرت عطا کرتا ہے، زمین و آسمان کے حقائق کو اپنے رب کے حکم سے آشکار کرتا ہے اور انسانوں کے راستوں کو جگمگا دیتا ہے۔ جہل و کفر کی تاریکیوں کی جگہ ایمان کی روشنی لے لیتی ہے، ذہن کا ہر گوشہ جالوں سے پاک ہو جاتا ہے۔

بشارتوں کا یہ سلسلہ اور مختلف پہلو قرآنِ مجید میں جابجا بیان ہوئے ہیں اور اِس طرح کہ پوری انسانی زندگی اِن بشارتوں کے دائرے میں آجاتی ہے۔ ایمان تو وہ تجارت ہے جس میں آدمی ساری دنیا کی طرف سے منہ موڑ کر اللہ اور اُس کے رسول کو اپنے لئے چن لیتا ہے اور اِس کے نتیجے میں اُس کا دلِ غنی ہر دو جہاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اللہ اور رسول پر ایمان لاکر وہ ہر باطل، ہر طاغوت، ہر ضلالت اور ہر گمراہی کی تردید ہی نہیں کرتا بلکہ وہ اِس سارے نظام کو تہس نہس کر دیتا ہے اور انسان دیکھ لیتا ہے کہ باطل بیت عنکبوت ہے اور اس سے کمزور اور کیا چیز ہو گی؟ وہ اللہ کی راہ میں اپنی ہر صلاحیت کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جنتیں جن کی منتظر ہیں اور مکان کو

تو مکین سے شرف حاصل ہوتا ہے۔ یہی وہ مومن ہیں جن کے لئے اللہ کی نصرت ہمیشہ حقیقت رہی ہے۔ یہی وہ مردانِ حق تھے، اور یہی وہ مردانِ حق ہیں جو تاریخ کی شاہ راہوں کو منور کرتے رہیں گے۔ وہی اِن بشارتوں کے مصداق تھے اور رہیں گے۔

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَ اَنْفُسِكُمْ ۔ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ O يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَ مَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ O وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ O (۴۰)

ایمان لاؤ اللہ اور اُس کے رسول پر، اور اللہ کے راستے میں اپنے مالوں اور جانوں (ہر صلاحیت) سے جہاد کرو۔ یہی بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ (اور عقل و شعور رکھتے ہو) اللہ تعالیٰ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، اور ہمیشہ بسنے والی جنتوں میں تمہیں بہترین (اور صاف ستھرے) مکان اور مسکن عطا کرے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی اور فوزِ عظیم۔ اور ایک اور چیز جو تم چاہتے ہو وہ بھی اللہ تعالیٰ عطا فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت اور جلد حاصل ہونے والی فتح۔ اور اے نبی ﷺ! اہلِ ایمان کو یہ بشارت سنا دیجئے۔

قرآنِ حکیم اور نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارتیں مومن کو زمانے کو بدلنے اور موڑنے والی قوت بنا دیتی ہیں۔ زمانہ اس سے بچ کر اپنا سفر طے کرنے میں عافیت محسوس کرتا ہے کیونکہ وہ اُس کے ہنگاموں کی تاب نہیں لا سکتا۔ مسلمان کی تکبیر، اُس کے کلمۂ، اعلائے حق نے وقت کے طلسم کو توڑ دیا۔

کہتا ہے زمانے سے یہ درویشِ جواں مرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق، تو بھی اُدھر جا
ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا بنگاہ قلندر سے گزر جا

میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہوں گا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تُو تو اُتر جا
توڑا نہیں جادو مری تکبیر نے تیرا؟
ہے تجھ میں مکرنے کی جرأت تو مکر جا
مہر ومہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر

شاہد

رسالت و نبوت کے بعد تنذیر و تبشیر پر مختصر گفتگو قرآنِ حکیم کی روشنی میں کی گئی۔ رسول بشیر و نذیر ہونے کے ساتھ ساتھ بلند ترین معانی میں شاہد و شہید بھی ہوتا ہے اور اُس کی یہ حیثیت اور مقام بشارت و تنذیر کا تکملہ ہے۔ ہمارے ایک بہت بڑے عالم اور صاحبِ نظر بزرگ کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے (میں نے راست نہیں پڑھا ہے) کہ نبیٔ اکرم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی میں ہر کمال موجود تھا، شہادت کے علاوہ، اور اللہ تعالیٰ نے اِس کمی کو اُن کے نواسے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے ذریعے پورا کیا۔ میں اُس رجلِ کبیر کے لئے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کرتا ہوں اگر انہوں نے یہ بات لکھی ہے، لیکن تمام رسولوں کو شہادت کا درجہ حاصل ہے اور ختم الرسل صلی اللہ علیہ وسلم تو مرتبۂ شہادتِ عظمیٰ پر فائز ہیں۔

شہید کس ذوق، کیسی سرمستی اور کیسے عاشقانہ انداز میں اپنی جان کا نذرانہ اپنے رب کے حضور پیش کر دیتا ہے کیونکہ وہ جنت کا نظارہ اسی دنیا میں کر لیتا ہے۔ شہادت کے معانی ہیں موجود ہونا، حاضر ہونا، شہید ان حقائق کو پیش کر دیتا ہے جو دوسروں کے دائرہ بصارت و بصیرت سے باہر ہوتے ہیں۔ شہید کے لئے وہ چیزیں بھی دائرۂ دید و ادراک میں شامل ہوتی ہیں جو دوسروں کے لئے غیب ہیں۔ شبِ معراج، صاحبِ معراج صلی اللہ علیہ وسلم نے ملائکہ، جنتوں اور جہنموں کو دیکھا، انبیائے کرام علیہم السلام سے ملاقات کی، اُن کی امامت فرمائی اور آنے والے ادوار کا مشاہدہ بھی کیا۔ تمام انبیاءؑ انہیں صداقتوں کی طرف انسانوں کو دعوت دیتے ہیں جن کا انہوں نے خود مشاہدہ کیا ہو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حیات بعد الممات پر جس درجہ یقین ہوگا ہم تو اُس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے، لیکن انہیں یہ حقیقت ایک شخصی مشاہدے کے طور پر قوم کے سامنے پیش کرنی تھی:

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰھٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ۔ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ ؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَۃً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْھُنَّ اِلَیْکَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی کُلِّ جَبَلٍ مِّنْھُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُھُنَّ یَاْتِیْنَکَ سَعْیًا ؕ وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ ۝ (۴۱)

اور (وہ موقع بھی سامنے رکھئے) جب ابراہیم نے کہا کہ اے میرے رب مجھے دکھادے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم (حیات بعد الموت پر) ایمان نہیں رکھتے؟ حضرت ابراہیمؑ نے کہا ایمان تو رکھتا ہوں مگر قلب کا اطمینان درکار ہے۔ رب جلیل نے فرمایا کہ اچھا چار پرندے لے لو اور اُن کو اپنے آپ سے مانوس کرلو (پھر ان کو کاٹ کر) اُنکا ایک ایک ٹکڑا الگ الگ پہاڑوں پر رکھ دو۔ پھر اُن کو آواز دو۔ وہ تمہارے پاس دوڑے چلے آئیں گے۔ خوب جان لو کہ اللہ نہایت صاحبِ اقتدار اور صاحبِ حکمت ہے۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی نفسی کیفیت اور اطمینانِ کلی کا اندازہ اِس سے پہلی آیت نمبر ۲۵۹ سے ہو سکتا ہے جس میں ایک ایسے شخص کا تذکرہ ہے جو ایک شہر مردہ سے گزرا۔ مکانوں کی چھتیں بیٹھ گئی تھیں اور دیواریں اُن چھتوں پر ملبے کی صورت پڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا کہ اللہ تعالیٰ اِس ملبے میں دبے ہوئے لوگوں کو قیامت کے دن کیسے زندہ کریں گے۔ اُس کی اِس حیرت کا جواب یوں دیا گیا کہ سو برس کے لئے اُس کی روح قبض کرلی گئی اور جب وہ پھر زندگی کی طرف لوٹا تو اُس سے پوچھا گیا کہ تم موت کی حالت میں کتنی مدت رہے۔ اُس نے جواب دیا ایک دن یا اس سے کچھ کم۔ فرمایا گیا کہ نہیں سو برس۔ تیرا جسم ہر تغیر سے محفوظ رہا، کھانے پینے کی کوئی چیز نہیں سڑی، مگر تیر گدھا سڑ کر ڈھانچا بن گیا ہے۔ اور پھر اُس کے گدھے کو اُس کی نظروں کے سامنے زندہ کر دیا گیا۔

حضرت ابراہیمؑ کو حیات بعد الممات پر یقینِ کامل تھا، مگر اس کی مختلف صورتوں، حالتوں اور کیفیتوں کا علم نہیں تھا، اسی لئے انہوں نے اپنے رب سے سوال کیا تاکہ اپنی قوم کو بتا سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چار پرندے پالنے کا حکم دیا تاکہ شناخت میں کوئی شبہ نہ رہ جائے۔ پھر وہ ذبح شدہ پرندے جڑ کر اُن کی آواز پر چلتے ہوئے (اڑتے ہوئے نہیں) چار پہاڑوں کی مسافت طے کر کے ان

کے پاس آگئے۔ یہ اجزا کے یک جان ہونے کی تفصیل بیان کرنے کا موقع نہیں، مگر اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی ذرات مجتمع ہو کر کیسے اپنا وجود پالیں گے۔

حیات بعد الموت اور آخرت کا مسئلہ ہر دور میں مشرکین کے لئے سب سے مشکل مسئلہ رہا ہے۔ قرآن کریم کی مکی آیات میں توحید اور آخرت کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے، اور انبیائے کرامؑ کو اس حقیقت کا شاہد بنایا گیا ہے، اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے والے بھی اسی شہادت کو اپنی زندگی کا ماحصل قرار دیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے نبیٔ آخر الزماں اور رسولِ ہر زمان و مکاں کے شاہد ہونے کا ذکر اُن کے مبشر، نذیر، داعی اللہ اور سراجِ منیر کے ساتھ فرمایا ہے اور اِس سے آپ کی ان صفات اور حیثیتوں کا رشتہ اور سلسلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔

یٰٓاَیُّھَالنَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاھِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّ نَذِیْرًا ○ وَّ دَاعِیًا اِلَی اللّٰہِ بِاِذْنِہٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا ○ (۴۲)

اے نبی ﷺ! ہم نے تم کو شاہد (اور گواہ) اور بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اللہ کی اجازت سے اس کی طرف دعوت دینے والا اور روشن چراغ سورج بنا کر۔

یہ مقامِ شہادت عجیب ہے اور اس کی کوئی نظیر انسانی تاریخ میں نہیں۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے مروی ہے کہ جب حضرت نوح علیہ السلام کی اُمت سے سوال کیا جائے گا کہ کیا تمہارے نبی نے اللہ کا پیغام تم تک پہنچادیا تھا تو وہ انکار کر دیں گے۔ حضرت نوحؑ سے سوال کیا جائے گا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ تم نے وحیٔ الٰہی اپنی قوم تک پہنچادی۔ کیا تمہارا کوئی شاہد ہے تو وہ جواب دیں گے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کی اُمت'' قومِ نوحؑ جواباً کہے گی کہ یہ لوگ تو ہمارے بہت بعد آئے، یہ کیسے شہادت دے سکتے ہیں۔ اُمتِ محمدیہ (علیٰ صاحبہا الف الف سلام) کہے گی کہ حضرت نوحؑ کی تبلیغی جدوجہد اور جاں فشانی کی خبر ہمارے رسول اور مخبرِ صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو دی تھی اور یہ خبر ہمیں اُن کے ذریعے عطا کی جانے والی آخری کتاب اللہ کے ذریعے ملی۔ سرورِ انس و جاں اپنی شہادت سے اپنی اُمت کی شہادت کی توثیق فرمائیں گے۔ یہ شہادت اُس سراجِ منیر کی شہادت ہوگی جس کے قلبِ روشن سے تمام مومنوں کے قلوب روشن اور منور ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور روشنی کا یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔ جس کا قلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی

روشنی سے جتنا روشن ہوگا، اسی درجہ وہ معتبر ہوگا۔(۴۳) ایک ضمنی نکتہ اس گفتگو سے یہ بھی ہمارے سامنے آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت محض ایک رسول کی بعثت نہ تھی بلکہ آپ کے ساتھ ایک اُمت بھی مبعوث ہوئی جو خیر الامم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کتنی عظیم، کتنی ہمہ جہت ہے۔ قتال فی سبیل اللہ میں اللہ کا رسول سب سے آگے تھا۔ اور اُحد آپ کے دانتوں کی شہادت کا شاہد ہے، اور آپ کے ایک دندانِ مبارک کی شہادت لاکھوں نفوس کی شہادت سے عظیم تر ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درجۂ شہادت کا کئی مقامات پر تذکرہ ملتا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا ۔ (۴۴)

اے رسول ہم نے آپ کو شاہد، بشارت دینے والا اور نذیر بنا کر بھیجا ہے۔(۴۵)

شاہد کا ترجمہ گواہ کے علاوہ حق کا اظہار کرنے والا بھی کیا گیا ہے۔(شاہ ولی اللہ دہلویؒ) اور اس ترجمہ میں نذرانہ جاں پیش کرنے والے شہید کا معنوی پہلو بھی بڑی حد تک کرتا ہے۔ اظہار حق بدر، اُحد، خندق اور حُنین کے میدانوں میں کیا جاتا ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا ○ (۴۶)

ہم نے بھیجا تمہاری طرف رسول جو تمہاری باتوں اور اعمال کا شاہد ہے، جیسے ہم نے بھیجا فرعون کی طرف رسول۔

رسول اپنی اُمت کا شاہد اور نگراں ہوتا ہے۔ حضرتِ موسیٰ کا تذکرہ اس لئے کیا گیا کہ رسولوں کی شہادت اور اُن کی امتوں کا طرزِ عمل اور ان کی یکسانیت اُجاگر ہو سکے۔ ان رسولوں نے اپنی قوموں کو اس دن کی ہولناکی سے خبردار کیا جو جوانوں کو بوڑھا کر دے گی، اور جب آسمان پھٹ جائے گا اور اُس دن بھی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت تمام انبیائے کرام کے ادائے فرائضِ نبوت کی شہادت ہوگی۔ یہ ہے اُس وجود کی عظمتِ شہادت جو اس وقت بھی نبی تھا جب سیدنا آدم علیہ السلام مٹی اور پانی کے درمیان تھے۔(۴۷) اور جو وجود اس وقت بھی ہمارا شاہد ہے جب ہماری ظاہری نظروں سے اُس کو اوجھل ہوئے چودہ صدیاں گزر چکی تھیں اور جو وقت کے آخری نقطہ تک ہمارا شاہد رہے گا۔ اور یہ شاہد اور شہید اُس شبنم صفت دل کا مالک ہے کہ دوسروں کی کوتاہی عملی بھی اُس کے دل کو محزوں اور آنکھوں کو اشکبار کر دے گی:

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ○ (۴۸)

اور اُس وقت یہ کیا کریں گے جب ہم ہر امت میں سے ایک شہید (گواہ) اور احوال کہنے والا بلائیں گے اور آپ کو بھی ان پر احوال بتانے والے شہید کی حیثیت سے کھڑا کریں گے۔

یوں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اُمت پر شہید ہوں گے اور چونکہ آپ کی نبوت تا قیامِ قیامت جاری رہے گی، اس لئے آپ کی شہادت کے دورانیئے کا ہمیں کوئی اندازہ نہیں۔ اس سے پہلے یہ بات عرض کی جاچکی ہے کہ آپ (اور آپ کی امت بھی) امم سابقہ کے بارے میں شہادت دے گی۔ اس آیت کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی ایک حدیث ہے حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں:

مجھ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے قرآن سناؤ۔ میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں آپ کو قرآن پڑھ کر سناؤں؟ قرآن تو آپ پر نازل ہوتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں (پڑھ کر سناؤ) پس میں نے سورۃ النساء کی قرأت شروع کی اور جب میں اس آیت پر پہنچا فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّ جِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ○ تو آپ نے فرمایا کہ بس کافی ہے۔ اور جب میں نے آپ کی طرف دیکھا تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ (۴۹)

آپ کے گریۂ بے اختیار کی جو تاویل علامہ قسطلانی نے کی ہے وہ دل کو چھو لینے والی ہے۔ آپ کے سامنے وقت شہادت کا منظر ورونقِ روشن آگیا اور اپنی امت کے بے عملوں اور بد عملوں کی کیفیت نے آپ کے دل کو مضطرب کر دیا، یہ بات آپ کے سامنے آچکی ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ ﷺ کی اُمت انبیائے سابقین کے حق میں اُن کی امتوں کے انکارِ باطل کے سلسلے میں گواہی دے گی۔ ذرا امام الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کے اس مرتبہ اور علوئے درجہ پر غور فرمائیے کہ آپ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی امت کو امتِ وسط کے مقامِ بلند پر فائز فرمایا۔ اس مقامِ بلند کے نتیجے کے طور پر یہ اُمت عالمِ انسانیت پر گواہ بن گئی اور آپ اِس امت کے گواہ اور شہید

بنائے گئے۔ یہ بات جس سلسلۂ کلام اور پس منظر میں بیان کی گئی ہے اس کو اِس جگہ پیش کرنے سے "وسط" اور "شہید" دونوں اصطلاحوں کے معانی واضح تر ہو جائیں گے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ط وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِىْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ط وَاِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ط وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ط اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ O (۵۰)

اور اِس طرح ہم نے تم کو امت وسط بنایا ہے تاکہ تم عالم انسانیت پر گواہ بنو اور رسول تم پر گواہ ہو، اور جس طرف ہم نے قبلہ مقرر کیا تھا (کہ تم اُدھر رخ کرو) تو یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کون رسول کا تابع رہے گا اور کون الٹے پاؤں پھر جائے گا۔ بے شک سخت بات تھی، سوائے اُن لوگوں کے لئے جو اللہ کی ہدایت سے فیض یاب تھے اور جن کو اللہ نے راہ دکھائی، بے شک اللہ لوگوں پر بہت شفیق اور رحیم ہے۔

ہادیٔ اعظم جن و انس شہادتِ عظمٰی کے آخری مقام پر فائز تھے، اور یہ شہادت ایک ایسی ذمہ داری ہے کہ آپ کے اتباع کے نتیجے میں امتِ مسلم بھی انسانوں پر شاہد بن گئی۔ اسی مرتبے اور ذمہ داری نے اُسے امتِ وسط بنا دیا ہے۔ امتِ وسط کے مقامِ شوق اور مرتبۂ بلندی سے ہمارے بیشتر لکھنے والے آسان گزر گئے ہیں۔ اور درمیانی راہ پر چلنے والی امت کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ بیشک یہ سامنے کے معنی ہیں، مگر اِس سے مراد وہ انسانی جماعت ہے جو عدل کو قائم کرتی ہے۔ زندگی کے ہر شعبے میں عدل کو اپنی فکر اور اپنے عمل کی بنیاد بناتی ہے جس سے اُس کے افراد کی زندگی میں اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ اور معاشرہ ہر ناہمواری سے دور رہتا ہے۔ بنیادی انسانی حقوق کے لئے کسی تحریک کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ یہ حقوق ہر انسان کو اُسی طرح مل جاتے ہیں جیسے چاند کی چاندنی اور سورج کی روشنی، اور یہ تو وہ ملت ہے جسے حکم دیا گیا ہے کہ عدل کے ساتھ گواہی دو خواہ وہ تمہارے اقربین، والدین اور خود تمہاری ذات کے خلاف جاتی ہو۔

اعتدال ہی صحت ہے اور اعتدال ہی حسن ہے۔ بڑھاپے کی ہر کیفیت کو میرزا غالب نے

کس طرح ایک شعر میں سمیٹ لیا ہے ۔

ہوگئے مضمحل قویٰ غالب
اب عناصر میں اعتدال کہاں

اور جمالیات کا مطالعہ کرنے والا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جمال کے بارے میں کتنے ہی نظریئے ہیں اور حسن کی کتنی ہی تعریفیں بیان کی گئی ہیں مگر بات یہاں پر آکر ختم ہوتی ہے کہ اجزا کے درمیان اعتدال کامل ہی حسن ہے۔

پھر آدمی کے بارے میں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ ۔

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

جو عنصر آدمی کو انسان بناتا ہے وہ یہی عدل ہے۔ روحانی، اخلاقی، فکری، سماجی اور جسمانی اعتدال۔ انبیائے کرام کی بعثت اور آسمانی کتابوں کے نزول کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے کہ لوگ عدل پر قائم ہوں اور معاشرے کو عدل پر قائم رکھیں۔

لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔ (۵۱)

کائنات حق اور عدل کی بنیادوں پر قائم کی گئی ہے اور امتِ مسلمہ کو اُمت وسط کہہ کر اس کو اس کے فرائض اور مراتب یاد دلائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُس کا یہ مرتبہ اُس کے فرض کی ادائیگی سے وابستہ ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عادل ترین انسان تھے اسی لئے وہ شہادت کے مثالی پیکر ہیں۔ قرآنِ مجید کتابِ عدل ہے جو انسانی معاشرے کو ہر فساد، ہر ناہمواری، ہر ظلم سے بچاتی ہے۔ مسلمان اگر عدل اور اعتدال کی روش کو چھوڑ دے تو وہ انسانوں پر شاہد نہیں رہے گا اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلبِ اطہر کے لئے غم، دکھ اور جراحت کا سبب بنے گا۔

ہم نے اس آیت کے پس منظر کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہ پس منظر تحویلِ قبلہ ہے۔ ہم اس کی تاریخ اور تفاصیل کو پیش کرنے کی جگہ صرف یہ عرض کریں گے کہ تحویل قبلہ کے ذریعے ایک بار پھر تعمیر کعبہ کے مقصد کو پورا کیا گیا (۵۲) اور دنیا کے سامنے یہ حقیقت بھی آگئی کہ اب بنی اسرائیل کی امامتِ اقوامِ عالم کا دور ختم ہوا اور یہ منصب اب محمدِ عربی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اُمت کو تفویض کر دیا گیا ہے۔ عالمِ انسانیت پر مسلمانوں کی شہادت اور مسلمانوں پر سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ابدی شہادت آپ کے مرتبۂ بلند کا نہایت نمایاں پہلو ہے، مگر آج اپنے اعمال کو دیکھتے ہوئے دل کی گہرائیوں میں یہی دعا جنم لیتی ہے کہ بارِ الٰہا قیامت کے دن۔

مکن رسوا حضورِ خواجہؐ مارا

تحویل قبلہ کے سلسلے میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا رویہ انسانی تاریخ میں اطاعت کے سلسلے میں مکمل ترین مثال کا درجہ رکھتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تمنا تھی کہ کاش بیت اللہ قبلہ بن سکے۔ مدینہ منورہ آنے کے بعد بھی سوا سال سے زیادہ عرصے تک بیت المقدس ہی قبلہ رہا۔ امید تھی کہ اس سے یہودیوں کے دلوں میں انسیت پیدا ہوگی اور وہ اشتراک قبلہ کی وجہ سے اسلام سے قریب تر آئیں گے، مگر ان کی تنگ نظری، ظلمتِ قلب اور نسلی برتری کے احساس نے اُن میں مسلمانوں کے کم تر ہونے کا احساس کر دیا اور پھر اللہ کی حکمتِ بالغہ کو یہ بات بھی مطلوب تھی کہ مومنوں کا امتحان ہو جائے اور مومن منافقوں سے معاشرتی طور پر الگ ہو کر زیادہ مرتب معاشرہ قائم کرلیں اور یہ معلوم ہو جائے کہ کون رسول ﷺ کا تابع رہے گا اور کون الٹے پاؤں پھر جائے گا۔

تحویل قبلہ کا حکم رجب یا شعبان ۲ھ میں نازل ہوا۔ اس سلسلے میں روایات میں تھوڑا بہت اختلاف ہے، مگر یہ اختلاف جگہ اور وقت کے بارے میں ہے، صحابۂ کرامؓ کے رویہ اور طرزِ عمل کے بارے میں نہیں۔ پھر یہ بات بھی ذہن میں رکھی جائے کہ اس عہد میں "قبا" اور "مدینہ" دو الگ بستیاں تھیں۔ ہادیٔ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے جانے سے پہلے کئی دن قبا میں تشریف فرما رہے۔ پھر اُسی دور میں مسلمانوں کی کئی مساجد تعمیر ہو گئی تھیں تاکہ انہیں زحمت نہ ہو اور وہ اپنے علاقے کی مساجد میں نمازیں ادا کر سکیں۔ پھر ابلاغ اور پیغام رسانی میں ایک آدھ دن کی تاخیر اور فرق اس عہد کے اعتبار سے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ بہت سی روایات کے مطابق ہادیٔ امم صلی اللہ علیہ وسلم مسجدِ بنو سلمہ میں ظہر کی نماز کی امامت کر رہے تھے کہ تیسری رکعت کے دوران تحویلِ کعبہ کا حکم آیا اور اُسی حالت میں آپ نے بیت اللہ کی طرف رُخ کر لیا اور صحابۂ کرامؓ نے کسی سوال، کسی الجھن اور کسی تذبذب کے بغیر آپ کی پیروی کی اور یہ سب کچھ محض اپنے چہروں اور رُخ کے بدل لینے کی بات نہ تھی۔ بیت المقدس مدینہ منورہ کے شمال میں ہے اور کعبہ (بیت اللہ) جنوب میں۔ یوں امام القبلتین کو نمازیوں کے پیچھے آنا پڑا ہوگا اور رُخ بدلا گیا ہوگا۔ مقتدیوں نے بھی از سر نو صف آرائی کی ہوگی۔ تحویلِ کعبہ کا علم مدینہ والوں کو نمازِ مغرب یا نمازِ عشاء میں ہوا ہوگا، یا دوسرے دن فجر کی نماز میں۔ ایک جگہ تو لوگ رکوع میں تھے کہ اُن تک منادی کی یہ ندا پہنچی کہ خبردار رہو۔ اب تمہارا قبلہ، کعبہ شریف ہے۔ اور رکوع کے عالم ہی میں وہ لوگ قبلہ رو ہو گئے۔

تحویل قبلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبۂ بلند اور رتبۂ عالی کی ایک بڑی شہادت ہے اور اس بات کی شہادت بھی کہ رب کائنات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رفیقِ اعلیٰ کو اُن کی خواہش اور تمنا کتنی عزیز تھی۔

قَدۡنَرٰی تَقَلُّبَ وَجۡهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبۡلَةً تَرۡضٰهَا ۖ فَوَلِّ وَجۡهَكَ شَطۡرَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ ؕ وَحَيۡثُ مَاكُنۡتُمۡ فَوَلُّوا وُجُوۡهَكُمۡ شَطۡرَهٗ ۝ (۵۳)

بیشک ہم تمہارے منہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، (انتظارِ وحی میں) پس ہم تمہیں اسی قبلے کی طرف پھیر دیں گے جسے تم پسند کرتے ہو۔ تم مسجدِ حرام کی طرف اپنا رُخ پھیر لو اور اب جس جگہ تم ہوا کرو اسی کی طرف رُخ کر لیا کرو (نماز ادا کرنے کے لئے)

یوں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار ختم ہوا۔ وہ انتظار جو اُن کے رب نے ایک امانت کی طرح اُن کے قلب میں رکھ دیا تھا اور مسجد حرام کے قبلہ نبیٔ آخرالزماں بنائے جانے کی پیش گوئی اہل کتاب کے صحیفے میں موجود تھی، کیونکہ تحویل قبلہ کی ایک علامتی حیثیت بھی ہے۔ اور وہ ہے امامتِ بنی اسرائیل کے خاتمے کی۔

رسول اکرم ﷺ اور امتِ مسلمہ کی شہادت کا یہی نکتہ سورۂ الحج میں بھی بیان فرمایا گیا ہے (۵۴) اس آیت میں مسلمانوں کو ملت ابراہیم بھی کہا گیا ہے اور یہ وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے بھی تمہارا نام مسلم رکھا ہے اور قرآن حکیم میں بھی تمہارا یہی نام رکھا گیا ہے۔ تاکہ رسول تم پر شہید (گواہ) ہوں اور تم عالم انسانیت پر گواہ ہو۔ اور تمہاری شہادت کی اساس اور شہادت یہ ہے کہ تم اقامتِ صلوٰۃ کی ذمہ داری پوری کرو اور زکوٰۃ اور اللہ سے وابستہ ہو جاؤ۔

(جاری ہے)

حواشیہ وحوالہ جات

۱۔ لوئیس معلوف / المنجد، بیروت، ص ۸۶۸،
۲۔ سورۂ الشعراء آیت ۲۱۴،
۳۔ مشکوۃ المصابیح / المکتب الاسلامی، بیروت / ج ۳ / ص ۷۶ ۴، ۷۷ ۴،
۴۔ ایضاً،
۵۔ مسلم / الصحیح،
۶۔ حوالۂ سابقہ،
۷۔ سورۂ بقرہ آیت ۶۔۷،
۸۔ سورۂ الفرقان آیت ۵۱ تا ۵۳،
۹۔ علامہ شبیر احمد عثانی / تفسیر عثانی / دارالاشاعت کراچی ۹۳ء / ج ۲ / ص ۲۱۱،
۱۰۔ سورۂ الاعراف آیت ۱۸۳،
۱۱۔ سورۂ توبہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لئے صاحب کا لفظ استعمال ہوا ہے، (آیت ۴۰) جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے مرتبہ صدیق کو اپنی سند عطا فرمادی،
۱۲۔ سورۂ الاعراف آیت ۱۸۵،
۱۳۔ مفتی محمد شفع / معارف القرآن / ادارۃ المعارف، کراچی ، ۷۶ء / ۴۸ / ص ۱۳۸۔۱۳۹،
۱۴۔ ملاحظہ کیجئے، محمد فواد عبدالباقی / معجم المفہرس، داراحیاء التراث العربی، بیروت / ص ۶۹۲،
۱۵۔ سورۂ الحجر آیت ۸۸، ۸۹
۱۶۔ سورۂ الحج آیت ۴۹،
۱۷۔ ایضاً، آیت ۴۲ تا ۴۸،
۱۸۔ علامہ شبیر احمد عثانی / تفسیر عثانی / کنویں جن پر پانی کھینچنے والوں کی بھیڑ رہتی تھی، آج ان میں کوئی ڈول پھانسنے والا نہ رہا اور بڑے بڑے پختہ، بلند، عالی شان، قلعی چونے کے محل ویران کھنڈر بن کر رہ گئے، جن میں کوئی بسنے والا نہیں، حوالہ یہاں آخریں)
۱۹۔ سورۂ حج آیت ۵۰، ۵۱،
۲۰۔ سوۂ المائدہ آیت ۱۹،
۲۱۔ سورۂ ہود آیت ۲،
۲۲۔ سورۂ سبا آیت ۲۸
۲۳۔ دیکھئے معجم الفہرس / ص ۶۹۲،
۲۴۔ سورۂ النساء آیت ۱۳۸
۲۵۔ سورۂ منافقون آیت ۸
۲۶۔ ایضاً،
۲۷۔ قولِ عمر فاروق رضی اللہ عنہ
۲۸۔ سورۂ البقرہ آیت ۲۵

۲۹۔ ایضاً، آیت ۲۲۳،

۳۰۔ سورۂ توبہ آیت ۱۱۲

۳۱۔ ایضاً آیت ۱۱۱،

۳۲۔ مسلم،

۳۳۔ مودودی / تفہیم القرآن / ج ۲ / ص ۲۳۹،

۳۴۔ زبیدی / اتحاف سادۃ المتقین، بیروت / ج ۷ / ص ۲۹۵،

۳۵۔ مفتی محمد شفیع / معارف القرآن / ج ۴ / ص ۴۶۹، یہ لفظ طلبِ علم کے لئے گھر سے نکلتے ہوئے طلبہ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔

۳۶۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، نبیٔ رحمت، مجلس نشریاتِ اسلام ی ج ۲ ص / ۱۲۳ تا ۱۴۲، حجۃ الوداع کے خطبوں کا خلاصہ،

۳۷۔ سورۂ یونس آیت ۱-۲

۳۸۔ ایضاً آیت ۱۶

۳۹۔ ایضاً آیت ۲،

۴۰۔ سورۂ الصف آیت ۱۱-۱۳

۴۱۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۶۰

۴۲۔ سورۂ احزاب آیت ۴۵، ۴۶

۴۳۔ اس روشنی کے حصول کا وسیلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر زیادہ سے زیادہ درود وسلام بھیجنا ہے، ہمارا درود وسلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں مسلسل پیش کیا جاتا ہے،

۴۴۔ سورۂ فتح آیت ۸

۴۵۔ ترجمہ شاہ ولی اللہ دہلوی، بہ ذیل آیت،

۴۶۔ سورۂ مزمل آیت ۱۵

۴۷۔ عجلونی / کشف الخفا / دارالتراث، بیروت / ج ۲ / ص ۱۹۱

۴۸۔ سورۂ نسا آیت ۴۱

۴۹۔ بخاری / الصحیح / باب قول المقری للقاری

۵۰۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۴۳

۵۱۔ سورۂ حدید آیت ۲۵

۵۲۔ ویسے بھی ہجرت سے پہلے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مسجد حرام میں نماز ادا کرتے تھے تو آپ ﷺ حجرِ اسود اور رکنِ یمانی کے درمیان کھڑے ہوتے تھے تاکہ کعبہ بھی سامنے رہے اور استقبالِ بیت المقدس بھی ہو سکے۔

۵۳۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۴۴

۵۴۔ ملاحظہ ہو آیت نمبر ۷۸،